باب پنجم

خلاصۂ بحث

اُردو شعر و ادب میں جدیدیت کے مختلف پہلوؤں کا اظہار، لگ بھگ ۱۹۵۰ء کے بعد زیادہ نمایاں اور طاقتور حیثیت اختیار کرنے لگا اور تاریخ اُردو ادب میں ایک نئے باب یعنی جدید دور کا آغاز ہوا۔ اس جدید دور نے اُردو شعر و ادب پر گہرا اثر ڈالا، اس نے اپنے ماضی کیا، ماضی قریب سے بھی رشتہ توڑ کر یہ صدا دی کہ ''مجھ میں ہی ادب کا اصل شعور ہے'' اور میرا نام ''جدیدیت'' ہے!

ابھی کچھ ہی عرصہ گزر چکا تھا کہ شعر و ادب کا یہ نظریہ مکمل طور پر پچھلے نظریوں کی طرح ''فلاپ'' ہو گیا اور شعر و ادب میں نئے نظریئے آنے لگے کسی نے اپنا نام ''عصریت'' رکھا، تو کسی نے کہا میں ''جدیدیت کے بعد کا نظریہ ہوں''۔ غرض ہر نظریہ، خواہ وہ جدیدیت سے پہلے کا ہو یا پھر جدیدیت کے بعد کا ہو، یہی تھا اور ہے کہ ''مجھ میں ہی ادب کا گہرا اور اصل شعور ہے''، تو مان یا نہ مان میں تیرا مہمان!

ہمارے ادباء میں سے اکثر نے جدیدیت کو بحیثیت تحریک پیش کیا تھا اور ہمارے علماء نے جدیدیت کو اسلام کے خلاف ایک بغاوت سمجھ رکھا تھا۔ دونوں نے اپنی اپنی تحریروں میں جدیدیت کو اس طریقے سے پیش کیا تھا، جیسے جدیدیت ایک طبقے کی جاگیر اور دوسرے طبقے کی دشمن ہو! ہمارے تنگ نظر ملاؤں نے تو جدیدیت کو ''جاہلیت'' کے مترادف ٹھہرایا تھا اس طرح مذہب اور ادب دو الگ الگ چیزیں نظر آ رہی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کا ایک دوسرے کے ساتھ دور کا بھی تعلق نہیں، اس طرح ہمارے اسلاف، جیسے خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، سید عبداللہ حسینیؔ، نظامیؔ، لطفیؔ، علامہ نورالدین ظہوریؔ، برہان الدین جانمؔ، جعفر زٹلیؔ، ولیؔ، رومیؔ،

سعدیؔ، اکبرالہ آبادی، سرسید، خواجہ میر دردؔ، محمد حسین آزادؔ، مرزا غالبؔ، ابوالکلام آزاد، مولانا حالیؔ اور اقبالؔ وغیرہ کے کیے گئے کاموں کو زبردست دھچکا لگ سکتا تھا یا پھر کافی دھچکا لگ چکا ہے اور ادب اور مذہب کو ایک دوسرے سے اس طرح الگ کیا گیا تھا کہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ادب اور مذہب کو یکجا رکھنا کوئی گناہ ہے اور اس پر طرہ یہ کہ اردو شعر و ادب کو جدت پسندانہ نظریوں کے تحت آگے بڑھایا جارہا تھا اور باضابطہ پرکھا جارہا ہے، کیا ادب ان نظریوں پر پورا اُترتا ہے یا نہیں۔

یورپی افکار سے ہمارے ادب کی جس صنف نے سب سے زیادہ فائدہ اٹھایا ہے، وہ تنقید ہے اور جدید اردو تنقید جن معیاروں سے ادب کو پرکھتی ہے، ان میں سے زیادہ تر یورپ ہی کی دین ہیں۔ جہاں اُردو ادب کو تنقید کے نئے طریقوں نے ایک طرح کا امتیاز بخشا وہی چھان پھٹک کے ذریعے مذہب کو ادب سے الگ کیا گیا اور ادب کو مذہبی تنقید کے اصولوں پر پرکھنے کے بجائے، مارکسی وغیرہ تنقید کے اصولوں پر پرکھا گیا۔ اس طرح آہستہ آہستہ مذہب کو ادب سے چلتا کیا گیا۔ مارکسی تنقید سے ہمیں استفادہ ضرور حاصل کرنا چاہیے اور ساتھ میں ہی مذہب کے اصولوں سے بھی مستفید ہونا چاہیے، تاکہ ادب میں اخلاق قائم رہیں۔

دوسری طرف ہمارے ملاؤں کو جدیدیت میں خرابیاں ہی خرابیاں نظر آئیں۔ جہاں تک ممکن ہوسکا انہوں نے اس کی نکتہ چینی کی اور اگر کہیں خوبیاں بھی دکھائی دیں تو اس پردہ ڈالتے رہے۔

جدیدیت کیلئے اُن اساسی عناصر کا جائزہ لینا ضروری ہے جو اس کے تشکیلی عناصر کہلائے جاسکتے ہیں۔ جدیدیت ایک اضافہ چیز ہے اور اضافیت کو آئن اسٹائن کے حوالے سے سمجھا جاسکتا ہے، تاکہ قاری سائنسی نقطۂ نگاہ سے واقف ہوجائے اور چونکہ موجودہ دور سائنسی دور

ہے، اس لئے قاری کو بھی چاہیے کہ وہ سائنسی تناظر میں چیزوں کو پرکھنے کا عادی ہو جائے۔

جدیدیت ایک ہمہ گیر، اضافی اور مسلسل تصور ہے۔ اردو ادب میں جدیدیت کا رجحان انیسویں صدی میں پیدا ہوا، جبکہ مغربی ادب میں یہ رجحان پندرہویں صدی میں ہی وجود میں آچکا تھا اور اردو ادب خصوصاً اُردو شاعری میں شعراء نے اس میں جو اضافے اور تجربات کئے اُنہیں جدیدیت کہا جاتا ہے، کیونکہ یہ تجربات اور اضافے وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ ہوتے رہے اور مسلسل ہوتے رہتے ہیں اور جدیدیت کا رجحان ان تجربات اور اضافوں کیلئے برابر اور مسلسل موقعہ فراہم کر رہا ہے، تاکہ انسان تغیر پسند بن جائے۔

جدیدیت کو مذہب سے جوڑنے کی صورت میں ادب میں اخلاق قائم رہتا ہے۔ جدید دور کا ادیب اپنی جرأت اور بے باکی کا بہت ڈھنڈورا پیٹتا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ وہ جو کچھ محسوس کرتا ہے، وہی لکھتا ہے اور سماج کی کسی بھی طاقت سے نہیں ڈرتا۔ لیکن جدید ادیبوں کی تحریروں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت اس کے برعکس ہے، ان نام نہاد ادیبوں میں اخلاقی جرأت کا فقدان ہے، اگر جرأت سے مراد فحش نگاری اور گالی گلوچ ہے۔ بلکہ حقیقی جرأت اور بے باکی کا معیار یہ ہے کہ آیا ادیب اپنے معاشرے کی اُمنگوں، آرزوؤں اور مسرتوں کی ترجمانی کرنے میں جھجک محسوس کرتا ہے یا نہیں اور جس ادیب کی مذہب میں تھوڑی بہت دلچسپی ہوگی، وہ ایسے فحاشی کا حامی نہیں ہوسکتا۔ اس لئے ادب اور مذہب دونوں ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوں۔

جدیدیت کے حقیقی معنیٰ روایت سے انحراف کرنا، نئے کی آنکھ بند کر کے تقلید کرنا اور ماضی اور مستقبل یا قدیم اور جدید کے درمیان خطِ امتیاز کھینچنا نہیں۔ بلکہ جدیدیت کے معنی و مفاہیم کی تلاش میں اس نتیجے پر پہنچا جاسکتا ہے کہ جدید اور قدیم کی حد بندی کرنا ناممکن بات

ہے، کیونکہ ماضی سے ہی حال بنا ہے اور حال سے ہی مستقبل بنے گا، آج کا حال کل کا ماضی کہلائے گا، مستقبل حال میں تبدیل ہوگا اور یہ تغیر اسی طرح ہوتا رہے گا اس لئے قدیم اور جدید کے درمیان خطِ امتیاز کھینچنا دشوار ترین مرحلہ ہے۔ اس کے ایک ہی رُخ کو کبھی قدیم اور کبھی جدید کہا جاتا ہے اور ان کی تقسیم کرنا بقول اقبالؔ کم نظری ہے۔

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصۂ جدید و قدیم

جدیدیت، جدید ہونے کا فلسفہ ہے، اس فلسفے کے مطابق ہر چیز میں تغیر پیدا ہونا، جدیدیت کہلاتا ہے، انسانی فکر ہمیشہ چلتے دریا کی طرح ہے، جو جوں جوں آگے بڑھتی ہے، اس میں کئی نئے موڑ آتے ہیں اور اس میں کئی معاونین بھی شامل ہوتے رہتے ہیں اور ان معاونین کی خصوصیات بھی اس دریا میں جذب ہوتے رہتے ہیں۔ ایک وقت ایسا آتا ہے، جب اس میں کمیت کی افزونی، کیفیت کی تبدیلی بن جاتی ہے، اس کی روح میں تبدیلی آجاتی ہے اور ہم اس سے جدیدیت کہتے ہیں۔

جدیدیت کے فلسفے میں سائنس اور تیکنالوجی کا گہرا اثر ورسوخ ہے، اس میں انسان پرستی سے زیادہ سائنس اور عقل پرستی کے اجزا شامل ہیں۔ عقل پرستی کی رو سے انسان اپنے تجربے اور مشاہدے کے دائرے میں ہر چیز کا شعور حاصل کرسکتا ہے۔ سائنس کی رو سے جو کچھ فطری ہے، اس کا مطالعہ سائنسی تجربے سے کیا جاسکتا ہے۔ جدید عہد سائنسی عقلیت کا عہد ہے، سائنسی عقلیت زندگی اور کائنات کے بارے میں ایک ایسے رویئے کی غماز ہے، جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ انسان کے مزاج، رویئے اور شعور میں گہری تبدیلی واقع ہوچکی ہے۔ نیوٹن اور آئن اسٹائن کی دریافتوں نے کائنات کا نیا تصور پیش کیا اور فلسفے میں بھی تبدیلی رونما ہوئی، جس

سے پرانے نظریئے ختم ہوئے۔ قرآن کا تصور پختہ ہوگیا، لوگوں میں روشن خیالی پیدا ہوئی اسی کو جدیدیت کا نام دیا گیا۔

سائنسی ترقی نے زمان ومکان کی دیواروں کو ڈھا دیا اور ساری دنیا ایک عالمی گاؤں میں تبدیل ہو چکی ہے۔ آج سائنسی انقلاب نے بین الاقوامی حیثیت حاصل کی ہے اور نئے عہد کے کلچر کا تصور سائنس کے بغیر نا تمام رہ جاتا ہے۔ سائنس ہر شعبہ ہائے زندگی پر اثر انداز ہوئی۔ اس اثر کو جدیدیت نے قبول کروایا۔ ہندوستان کی تہذیبی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کے وسط سے ہی انگریزوں کے ہندوستان میں آنے کے بعد یہاں کے روایتی تہذیبی تصورات مثلاً ذات پات، مشترکہ خاندان، پردہ سسٹم، توہم پرستی، اخلاقی نظریے اور روحانیت مغربی علوم وفکر سے متاثر ہونے لگے اور بیسویں صدی کی آمد پر ملک میں سماجی تبدیلیوں کا عمل تیز تر ہوتا گیا۔

یوں تو برصغیر میں جدیدیت کا آغاز وارتقاء بابر کے آنے کے بعد سے شروع ہوا۔ فن تعمیر، تعلیم، فنون لطیفہ، مصوری، ادب واخلاق، فوجی ساز وسامان کے اعتبار سے ہندوستان میں نئے دور کا آغاز ہوا۔ جہاں تک اردو ادب کے حوالے سے برصغیر میں جدیدیت کے آغاز و ارتقاء کا تعلق ہے۔ یہ غالبؔ کے دور سے شروع ہوتا ہے۔

غالبؔ کے زمانے میں ہمارے ملک میں تہذیبی اعتبار سے روایت سازی کے مقابلے میں، روایت شکنی کا عمل زوروں پر تھا، جو اس عہد کی زندگی کے ہر شعبے میں عیاں تھا، اپنے عہد کی صورت حال سے اُکتاہٹ ہی تبدیلی کی آمد آمد کی دلیل تھی، یہی وہ زمانہ تھا، جب ہمارے یہاں سیاسی تبدیلی کی خواہش بھی جنم لے رہی تھی۔ مغلوں کے دور عروج کی داستانیں اپنے تہذیبی شکوہ پر فخر کو قائم رکھے تھیں، مگر جیسے جیسے وہ زمانہ دور ہوتا گیا، ویسے ویسے اپنی محرومی کا

احساس بھی بڑھتا گیا۔ ان حالات میں دو ہی صورتیں سامنے آسکتی ہیں یا تو کسی متبادل کی تلاش کی طرف توجہ دی جائے یا ماضی کی بازیافت کی تدابیر کی طرف دھیان دیا جائے۔ یہ دونوں رجحانات ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ماضی کی بازیافت جوں جوں امکان کی حدوں سے دور ہوتی جاتی ہے، توں توں نئے متبادل کی تلاش زیادہ سرگرم ہوتی جاتی ہے۔ ایسے دور میں جب دو نظام ہائے زندگی کی کشمکش ہو رہی ہو، تو ایک عام بے یقینی، حیرت اور تشکیک کا ہونا لازم ہے۔ خود اپنے نظام پر بے اعتباری اور غیروں سے آنے والے نظام سے بڑی حد تک ناواقفیت، اس کی ظاہری چمک دمک سے مرعوبیت اور اندرونی مضمرات سے بے خبری، سب ملا کر جس قسم کی ذہنی و فکری فضا کی تشکیل کر سکتے تھے اس کا سب سے قوی، دل کش اور موثر انعکاس غالبؔ کے ہاں نظر آتا ہے۔ انیسویں صدی میں پیدا ہونے والی ہماری ادبی شخصیتوں میں اب تک سب سے زیادہ معلومات غالب کے بارے میں ہی موجود ہیں۔

غالبؔ پرانی روایتی آغوش میں نہ صرف پلے بڑھے تھے، بلکہ ان کے خون میں اس سے اس حد تک وابستگی تھی کہ تمام عمر خلعت، خطاب، وظیفہ وپنشن، وغیرہ کی تمنا، پھر اس پر فخر کے ساتھ جیتے رہے، مگر مشاہدات اور تجربات وحادثات نے ان کے ذہن کو نئی سمتوں میں سفر کرانا شروع کیا۔ مغل سیاست کا قلعہ میں محصور ہونا، دہلی اور نواح میں بڑتی ہوئی انگریزی عملداری اور پھر دہلی شہر کی تہذیب، علمی اور فکری زندگی میں نئے اثرات، اخبارات اور اشخاص کے ذریعے نئی اطلاعات غالبؔ ہی نہیں، اس عہد کے ہر شخص کو کچھ نہ کچھ نیا منظر دکھا رہے تھے، غالب کا کلکتہ کا سفر، ان کی زندگی میں ایک نئے اور معنی خیز موڑ کا سبب بنا، چنانچہ اب غالبؔ پرانے ہوتے ہوئے بھی اس حد تک نئے ہو چکے تھے کہ سرسید جیسے شخص کو، جو آئندہ زمانے میں مغربیت کا سب سے بڑا علم بردار ہونے والا تھا۔ ''آئین اکبری'' کی تقریظ کے ذریعے

ایک نئی سمت دکھا رہا تھا۔

یہ وہی زمانہ ہے جب اخبارات کی طباعت اور اشاعت شروع ہوئی۔ پرنٹنگ پریس ایک نیا انقلاب لایا۔ اخبارات کے ذریعے مغرب کے سیاسی، معاشی وصنعتی نظام کے بارے میں اطلاع آنی شروع ہوئی۔ اس نے اہل فکر کو ایک نئے انداز میں سوچنے پر مجبور کیا۔ ایک متبادل معاشی ماڈل جس کی بنیاد سرمایہ دارانہ صنعتی نظام پر تھی، ہر اعتبار سے پرکشش تھا، مشہور مصنوعات اور نئی نئی ایجادات کا بازار میں آنا ہی، نئی حیرتوں کے باب کھولنے لگا تھا۔ ڈاک کا متبادل نظام، نیا عدالتی نظام اور انتظامی ڈھانچہ، شخصی یا خاندان پر مرکوز نظام کی جگہ، اب اداروں کی تشکیل ہونے لگی تھی۔ جس سے ایک نئے قسم کا انقلاب برپا ہوا۔

اُنیسویں صدی کے آغاز میں ہی، ہندوستان کی پوری فضا میں کچھ دوررس اور نتیجہ خیز تبدیلیاں عمل میں آئیں۔ مغربی تہذیب وادب کی سرگرمیوں نے اور نامانوس حکومت کے تسلط نے انسانی ذہن کو متحرک کردیا اور لوگوں میں تحفظِ ذات کا جذبہ اُجاگر ہوا۔ اسی زمانے میں ہندوستان کے مسلمانوں کو حوصلہ شکن حالات سے گزرنا پڑرہا تھا اور انگریز شمالی ہندوستان پر پوری طرح قابض ہوگئے تھے۔ چنانچہ مسلمانوں کی رہنمائی کیلئے باحوصلہ شخصیتیں سامنے آگئیں۔ جن میں سر سید احمد خان اور سید احمد بریلوی کا نام سرفہرست ہے۔ سر سید احمد خان اور سید احمد بریلوی دونوں نے مسلمانوں کی مذہبی فکر کا جائزہ لیا اور سماجی قدروں پر غور کرکے قلم سے اصلاح کا مشن شروع کیا۔ سید احمد بریلوی نے ایک تحریک چلائی، جس میں اگرچہ کوئی منضبط پیغام نہ تھا۔ لیکن اس تحریک نے لوگوں کے دلوں میں جوش اور ولولہ پیدا کیا۔

سید احمد خاں کی تحریک کا باضابطہ ایک مشن تھا، جس نے آگے بڑھ کر ایک بڑی خدمت انجام دی۔ یہ تحریک مسلمانوں کیلئے ایک عظیم تحریک ہے۔ جس نے ہندوستان کے مسلمانوں

میں ایک انقلاب پیدا کیا۔

انیسویں صدی کا ہر ہندوستانی، ذہنی، سیاسی اور ثقافتی انتشار کا شکار تھا اور اس انتشار اور خلفشار کو پیش کرنے کیلئے اس وقت کا ادب ناکافی تھا۔ غزل عشق و عاشقی اور تصوف تک محدود تھی اور غزل کے مقابلے میں اور کوئی صنف اس وقت اتنی طاقتور نہیں تھی جو ترسیل کا ذریعہ بن سکے۔ ہندوستان کی فضا کو دھیان میں رکھتے ہوئے غزل میں وسعت کی ضرورت تھی، جس کا شکوہ پہلی بار غالبؔ نے کیا ؎

بقدر شوق نے ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت میرے بیان کیلئے

اس طرح اُردو شعر و ادب میں باضابطہ تنقید شروع ہوئی۔ غالبؔ پہلے شاعر ہیں، جو غزل کی تنگ دامنی کے شکوہ سنج ہیں۔ اُنہیں اس میدان میں ہر بار وسعت، جامعیت کا طالب ہونا پڑا ہے۔ نئی صورت حال سے سمجھوتہ کرنا اور نئے سماجی و سیاسی شعور کا احاطہ کرنے کیلئے غالبؔ نے اس وقت کی غزل کو ناکافی تصور کیا۔ اس میں دورائیں نہیں کہ اُردو ادب کو جدید رجحانات سے ہمکنار کرنے میں غالبؔ کا نام سرفہرست ہے، اردو ادب کی تجدید و تعمیر نو میں غالبؔ کی متحرک، متنوع اور جاندار روایت کے اثر و نفوذ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ غالبؔ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے روایت کو کھلی فضاؤں میں پرواز کرنا سکھایا اور نئے خلاؤں سے روشناس کیا۔

غالبؔ کے بعد برصغیر میں جن لوگوں نے جدیدیت کے آغاز و ارتقاء میں اہم رول نبھایا، اُن میں سر سید احمد خان اور الطاف حسین حالیؔ کا نام سرفہرست ہے۔ ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور ادبی تاریخ میں ۱۸۵۷ء کا سال ایک اہم ترین سال ہے۔ اسی سال صدیوں پرانی مغل حکومت اور اس کے ساتھ مغلیہ تہذیب کا بھی خاتمہ شروع ہونے لگا۔ سماج میں مغربی اثرات

نظر آنے لگے، اردو زبان وادب میں بھی انگریزی ادب کا اثر پڑنے لگا۔ مروّجہ نظام سے بیزاری اور بغاوت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ کچھ خلاق ذہن مثالی دنیا کا خواب دیکھنے لگے۔ اس کے لئے کچھ اصلاحی تحریکوں نے جنم لیا۔ ان تحریکوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی تعلیم وتہذیب ہماری فکری اور عملی زندگی پر تیزی کے ساتھ اپنا اثر کرنے لگی اور کچھ ہی عرصے میں جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ایک نسل تیار ہوگئی۔ ان ہی حالات میں سرسید احمد خان نے اصلاح کا بیڑا اُٹھایا۔ سرسید اولین مسلم دانشور ہیں جنہوں نے معاشرے کے ہر پہلو پر گہری نظر ڈالی۔ سرسید جانتے تھے کہ مسلمانوں کی مذہبی، سماجی اور سیاسی زندگی کی اصلاح بغیر تعلیمی اصلاح کے ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے سرسید نے اپنی تحریک کا آغاز تعلیم سے کیا۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ پہلو مسلمانوں کی زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرنے لگی۔ سرسید اپنی قوم کو جدید علوم سے روشناس کرانا چاہتے تھے۔ وہ اس شاعری کے خلاف تھے جس میں افادی پہلو نہ ہو۔

غالبؔ اور سرسید کے بعد اُردو ادب میں جدیدیت کے تیسرے بڑے علمبردار حالؔی ہیں۔ ڈاکٹر بشیر بدر لکھتے ہیں، ''جس طرح وقت نے سرسید کو ڈھونڈ نکالا اسی طرح سرسید نے حالؔی کی تلاش کی''۔ حالؔی سرسید کی ادبی آواز بن گئے، حالؔی نے روایتی غزلوں کے برخلاف مقصدی غزلوں پر زیادہ زور دیا۔ وہ رسمی عناصر سے شاعری کو آزاد کروانا چاہتے تھے۔ انہوں نے اردوادب میں تنقید کا باضابطہ آغاز کیا۔ اُنہوں نے ''مقدمہ شعروشاعری'' لکھ کر شعروادب کی دنیا ہی بدل ڈالی۔ انہوں نے شاعری کیلئے پیمانے مقرر کئے اوران پیمانوں نے شاعری کو تبدیل کردیا۔ اگر یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ حالؔی نے اردوشاعری خصوصاً غزل میں ایک جدید روح پھونک دی۔ شاعری میں ایسا انقلاب آیا کہ اُردوشاعری حسن کی رسمی دنیا سے الگ ہوکر حقیقت پسندی کی طرف حائل ہوئی۔

غالبؔ، سرسیدؔ، حالیؔ، اقبالؔ اور پھر مختلف تحریکوں سے اُردو ادب کو کافی فروغ حاصل ہوا اور اُردو ادب جدیدیت کے معیار پر پورا اُترنے لگا۔ لیکن جہاں جدیدیت سے ایک انقلاب رونما ہوا وہیں کچھ مسائل بھی پیدا ہوئے اور اب جدیدیت نے ان مسائل کے حل کیلئے بھی کوششیں شروع کیں اور آہستہ آہستہ یہاں بھی کامیابیاں نصیب ہوئیں۔

قبل مسیح سے ہی تقریباً ادب میں یہ بحث شروع ہوئی کہ فن کی حقیقت اور ماہیت کیا ہے اور کیا ہونی چاہیے؟ کیا فن زندگی کی حقیقتوں سے اس قدر جڑا ہوا ہے کہ اس کی ماہیت کا تعین ان ہی حقیقتوں کی بنیاد پر ہو سکے یا فن اپنے آپ بھی کوئی وجود رکھتا ہے۔ افلاطون اور ارسطو کے نظریات شعر میں، جو اختلاف نظر آتا ہے، وہ بھی دراصل فن سے متعلق اسی بحث کو سامنے لاتا ہے۔ افلاطون شاعری کو نقل کی نقل ہی نہیں کہتا۔ بلکہ اس کو اخلاق کا دشمن بھی قرار دیتا ہے۔ گویا کہ وہ فن سے اخلاقی نوعیت کی مقصدیت کا طلب گار ہے اور زندگی کی خارجی حقیقتوں سے فن کے راست تعلق کا قائل ہے۔ اس کے برعکس ارسطو شاعری کو ایک اعلیٰ فن قرار دے کر اس کی وکالت کرتا ہے اور اس سے حاصل ہونے والی مسرت کو ہی اس کا بنیادی مقصد کہتا ہے۔ اس لحاظ سے ادب میں دو طرح کے نظریئے قبل مسیح سے ہی سامنے آئے۔ ایک ادب برائے ادب اور دوسرا ادب برائے زندگی، جدیدیت دونوں نظریوں کی حامی ہے اور دونوں نظریوں کو سامنے رکھ کر کام کرنا چاہتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں، لیکن جدیدیت کے سامنے یہ سارے مسئلے ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔

موجودہ صدی سائنس اور ٹیکنالوجی کی صدی ہے۔ یہ صدی پچھلی صدیوں سے خاصی مختلف ہے، اس لئے اس صدی کے مسائل بھی الگ ہیں۔ ان مسائل نے ادب پر گہرا اثر ڈالا۔ انسان پرستی اور عقلیت پرستی نے ادب پر حکومت قائم کی اور مسائل کے نت نئے طریقے سامنے

آئے۔مغربی نقادوں اور مفکروں جن میں نیوٹن، ڈیکارٹ، لاک، ہارٹلے، برکلے، ہیوم اور ڈارون وغیرہ کے نتیجۂ فکر نے سائنسی علوم اور مطالعہ کے نام نہاد قطعی طریقوں کے نام پر انسان کو اشرف المخلوقات اور عبد کے بجائے میکانکیت اور نامیت، بلکہ غیر نامیاتی مادہ میں تبدیل کر کے رکھ دیا۔اب جزوی تجربات،فروعی استنباط اور فارمولہ سازی کی ایک ایسی وبا پھیلی کہ اس نے مابعد الطبیعاتی، اخلاقی اور انسانی تصور کو مسخ کرنے کے بعد جملہ علوم وفنون کو بھی مسخ کر کے رکھ دیا۔ کیونکہ انسان کو معاشی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو وہ مختلف طبقات میں بٹ کے رہ جاتا ہے۔حیاتیاتی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو وہ بندر کی ترقی یافتہ صورت نظر آتا ہے اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو وہ جبلی محرکات اور روحانی تقاضوں کی ایک آماجگاہ نظر آتا ہے، جہاں زندگی کشمکش اور تصادم پر مبنی ہے۔ چنانچہ انسان کی طرح اس کے فن کی تعبیر بھی اسی مادی و میکانیکی جبر کے ماتحت ہونے لگی۔

سائنس کی ایک شکل تیکنالوجی کی وسعت ہے۔اس نے نت نئے مسائل کو جنم دیا۔ مثلاً قومی معیشت، خارجی پالیسی، ماحول کی کثافت، اعصابی تناؤ، بین الاقوامی کھچاؤ، کثرتِ کار اور عدیم الفرصتی کے مسائل انسان کے ذہنی انتشار کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ سائنس کے مہلک ہتھیاروں نے نہ صرف پوری تہذیبی زندگی کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے، بلکہ بڑی طاقتیں جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ ثابت کرنے پر تلی ہیں۔اس ضمن میں اشتہار بازی، پروپگنڈا، ماس میڈیا، سرد جنگ جیسے ہتھیار استعمال کئے جا رہے ہیں۔ ان حالات میں نیا فرد بے بسی، محرومی اور انتشار کا شکار ہو گیا ہے۔

بنیادی طور پر نئے انسان کی شناخت یہ ہے کہ وہ خود آگہی کے نقطۂ عروج پر پہنچ چکا ہے۔ اس کی نظر میں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ انسان کیا ہے؟ انسان اور کائنات کا باہمی رشتہ کیا

ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ مانا جائے کہ ایسے سوالات جتنے جدید ہیں اتنے ہی قدیم بھی ہیں۔ یہ سوالات انسانی ذہن کو تناؤ میں مبتلا کرتے رہے ہیں۔

جدیدیت کا نظریہ یہ ہے کہ ایسے کئی سوالات کا جواب فراہم کرنا ہے، تاکہ ذہن تناؤ میں مبتلا نہ رہے اور مسائل کو حل کرنے کا متلاشی بنے، نہ کہ مسائل سے گھبرا کر راہ فرار اختیار کی جائے۔ جدیدیت کی رُو سے انسان حیات و کائنات، معاشرتی رشتوں، موت اور دیگر مسائل کے بارے میں غیر روایتی طریقوں سے سوچتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ جدیدیت انسانی سوچ میں تبدیلی چاہتا ہے، تاکہ مسائل پر قابو پایا جا سکے۔

جدید اُردو ادب میں جو ذہنی خلفشار اور حسی الجھنیں پائی جاتی ہیں، اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دنیا کے اکثر ملکوں کے ادیب اِن دنوں اسی قسم کی الجھنوں کا شکار ہیں۔ وہ زندگی کو نئے انداز سے دیکھنے، سمجھنے اور برتنے کی کوشش میں مصروف ہیں، تاکہ دورِ جدید کے تجربات اور احساسات کی صحیح ترجمانی کر سکیں۔

اقبال کی جدیدیت کے حوالے سے اُن کے فکری مآخذ کا ایک سرسری جائزہ لینا ضروری ہے، تاکہ اقبال کے پس منظر سے واقفیت حاصل ہو جائے۔ علامہ اقبال جدیدیت کے سب سے بڑے علمبردار تھے، کیونکہ وہ روایت سے بھی مستفید ہونے کی تلقین کرتے تھے اور نئے زمانے کے نئے تقاضوں کا بھی خیر مقدم کرتے ہوئے اُنہیں ناگزیر سمجھتے ہیں۔ وہ اندھی تقلید کے قائل نہیں، یہی وجہ ہے کہ اُن کی صدا نے بلندیوں کو چھو لیا، اُن کی صدائیں بجائے خود ایک ادبی دور اور جدید دور کی دریافتیں تھیں۔ اُن کا نظریۂ جدیدیت، حقیقت شناسی اور حقیقت بینی پر مبنی تھا ؎

آئینِ نو سے ڈرنا، طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل کٹھن یہی ہے، قوموں کی زندگی میں

اے اہلِ نظر، ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ نظر کیا

بلبل کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

اقبال نے اپنی تخلیقات سے واضح کر دیا کہ وہ ادیب کو دراصل معاشرے کا ضمیر اور اس ضمیر کی آواز بنانا چاہتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک ادیب ہی معاشرے کا حساس اور باشعور عنصر ہے اور اس اعتبار سے ادیب پر بہت سی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

اقبال قدیم اور جدید یا روایتی اور عصری ادب پر گہری نظر رکھتے تھے۔ وہ مشرقی روایات سے بخوبی واقف ہونے کے ساتھ ساتھ مغربی افکار سے بھی خوب واقف تھے۔ اُنھوں نے ادب میں نئے تجربے بھی کیے اور قدیم علامتوں سے نئے معانی بھی برآمد کیے۔ اس طرح ان علامات میں جان ڈال دی۔

اقبال نے، مغربی فکر سے خاصا استفادہ کیا، تاہم وہ قدیم سرمائے کو بھی نظر انداز کرنے کے قائل نہیں تھے۔ فلسفیانہ سطح پر وہ جملہ عوامل کو اکائی کی صورت میں دیکھتے تھے اور ماضی، حال اور مستقبل تینوں کو ایک کُل کے طور پر متشکل کرنا چاہتے تھے۔ وہ جدید علوم کی افادیت کے منکر نہ تھے، تاہم جدید اور قدیم کے درمیان خطِ امتیاز کھینچنے کے بھی قائل نہ تھے۔ اس لئے ان کے یہاں بعض مغربی خرابیوں کا برملا اظہار بھی ملتا ہے اور قدیم سرمایہ علم کی توسیع کا احساس بھی۔ ان دونوں کے درمیان ایک نئی وضع کی تلاش ان کے نزدیک ضروری تھی۔ اگر ہم فکرِ اقبال کے ان

پہلوؤں کو صحیح تناظر میں نہیں دیکھیں گے، تو بعض جگہ ہمیں تضاد کا شبہ ضرور ہوگا۔ یہ احساس شاید اس لئے بھی ہوتا ہے کہ اکثر اقبال کے شعری سرمائے ہی سے ان کے اساسی تصورات کا استخراج کیا جاتا رہا ہے اور نامعلوم وجوہات کی بناء پر ان کے نثری کارناموں کو زیادہ لائق اعتناء نہیں سمجھا جاتا۔ مگر ان کے نثری کارنامے، میری نظر میں شعری کارناموں کی طرح اہمیت کے حامل ہیں۔

موجودہ صدی میں اقبال ایک منفرد اور عظیم مفکر، دانشور اور فلسفی کے طور پر سامنے آئے ہیں۔ انہوں نے جدید شاعری کے فنی اور تاریخی ارتقاء میں اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ انہوں نے نہ صرف شاعری کی جدید تشکیل میں اہم حصہ ادا کیا، بلکہ اسے جدید عہد کے تصورات کی وسعتوں اور فکری بلندیوں سے بھی آشنا کیا ہے۔ انہوں نے نہ صرف انیسویں صدی کے اردو ادیبوں کی روایت کی توسیع کی، بلکہ جدید مغربی اور مشرقی فکری تحریکات سے بھی استفادہ کیا۔ انہوں نے صرف مروجہ موضوعات کی تصویر کشی پر اکتفا نہ کیا، بلکہ ایک بڑے مفکر شاعر کے گہرے اور وزنی افکار سے بھی اپنی تخلیقات کو مالدار بنایا، ان کی شخصیت وسیع اور ہمہ گیر تھی، اس لئے ان کی تخلیقات پر بھی ان کی توانا اور ہمہ گیر شخصیت کی گہری چھاپ ہے۔

اقبالؔ اکیسویں صدی کے شاعر ہیں اور اُن کی شاعری میں سائنس کو عمل دخل حاصل ہے، ان کی تخلیقات کا مطالعہ کرنے سے قاری کو یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے وہ کوئی ماہرِ فلکیات ہوں۔ انہوں نے افلاک کا مشاہدہ قرآن کے آئینے میں کیا ہے۔ یہی وجہ ہے ان کی فلسفۂ فلکیات میں خاصی دلچسپی ہے اور اسی وجہ سے اقبال کا فلسفۂ فلکیات، جدید سائنس کی کسوٹی پر پورا اُترتا ہے۔

اقبالؔ کے فلسفے میں تغیر کو نمایاں حیثیت حاصل ہے، وہ کائنات اور اس سے وابستہ مخلوق

کوحرکت میں رہنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک کائنات پیہم نشوونما پانے والی اور ارتقاء کوش حقیقت ہے اور کائنات کی یہ حقیقت خود مکتفی ہے۔ کائنات کی کن فیکونی کیفیت اس کی کمی پر نہیں بلکہ اس کے اظہارِ ذات کی وجہ سے ہے اور خود یہ کائنات بھی ذات کا ایک پیرایۂ اظہار ہے۔ ان معنوں میں سکون وثبات فریب نظر ہے۔

اقبآل نے کائنات کو حرکی قرار دیا۔ اُنہوں نے اپنے اس حرکی تصور کا اطلاق تاریخ، سماج، تمدن اور عمرانی صورت حال پر کر کے ان کو بھی ایک حرکت سے تعبیر کیا جو کبھی بھی کسی ایک حالت پر قرار نہیں پاتی۔ اقبال نے مرنے کے بعد پھر زندہ ہونے کو بھی ایک مسلسل حرکت سے تعبیر کیا اور موت کو بھی زندگی کی ایک حالت قرار دیا ہے۔

کائنات کیا ہے؟ تخلیق کائنات کا مقصد کیا ہے؟ ان سوالات کے جوابات مذہب میں بھی ملتے ہیں اور فلسفہ میں بھی، اقبال کا فلسفۂ کائنات تخلیقِ کائنات کو سمجھنے کا ایک نظریہ ہے اور انہیں اس بات کی آرزو تھی کہ تخلیقِ کائنات کے بارے میں جانکاری حاصل ہو۔ انہوں نے مذہب، فلسفہ اور تصوف کی مدد سے یہ راز جاننے کی کوشش کی۔ اس راز کو سمجھنے کیلئے یہ ضری تھا کہ وہ جبر وقدر اور انسان کے فکر وعمل کی آزادی کے اہم سوالوں پر غور کریں۔ جبر وقدر کے ساتھ ساتھ تقدیر کا سوال جڑا ہوا ہے۔ کائنات کا راز کیا ہے۔ کیا ستارے اور سیارے تقدیر پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اقبال اس مقدر پرستی کے خلاف تھے۔

تیرے مقام کو انجم شناس کیا جانے
کہ خاکِ زندہ ہے تو، تابع ستارہ نہیں

تقدیر اور ستارے کا کوئی رشتہ نہیں بلکہ یہ ایک بیوقوفانہ فعل ہے۔ اقبآل اپنے اشعار اور اپنے دوسرے خطبے میں یہ واضح کیا ہے کہ وہ ایسی کائنات کے تصور کے قائل نہیں جس کی ساخت

پہلے سے طے شدہ ہے۔ اقبال کے مطابق یہ نظریہ عمل کے نظریے کے خلاف ہے، اگر سب کچھ طے شدہ ہے، پھر مصروفِ عمل کیوں رہنا ہے۔

اقبالؔ کے ہر نظریے میں تغیر یا عمل کا عمل دخل ہے۔ ان کا تصور اجتہاد حرکت کا ہی ایک نظریہ ہے۔ اُن کے نزدیک وحدتِ فکر اور اجتہاد کا عمل بڑھتے ہوئے تمدن اور تسلسل حیات کیلئے حرکت اور عمل کے بغیر ممکن نہیں۔ زندگی میں خیر و شر کی قوتیں ایک دوسرے سے مصروفِ پیکار ہیں۔ انسان ایک اختیار یافتہ وحدت ہے۔ وہ شیطانی قوتوں سے ہر وقت برسرِ پیکار رہتا ہے۔ اور اقبال کے مطابق جب انسان اجتہاد کی گہرائیوں میں اُترتا ہے، تو فکر ذہنی کی تشکیلِ نو ہو جاتی ہے۔ انسان مسلسل جدوجہد میں مصروفِ عمل ہے اور یہی زندگی کا لازمی عنصر ہے۔ اقبال عمل اور حرکت کو زندگی کا دوسرا نام کہتے ہیں۔ اُن کے مطابق حرکت تکمیل ذات میں بھی معاون ہے اور تکمیل کائنات میں بھی اور مذہب میں عمل زندگی میں اجتہادی فکر بروئے کار لانے کا نام ہے۔

اقبال نے اجتہاد پر زبردست زور دیا ہے۔ ان کے نزدیک اجتہاد کے تصور نے ہر طرح سے ملوکیت، آمریت، استبدادیت، مذہبی پیشوائیت اور مذہبی استدلال کی جڑ کاٹ کر رکھی ہے اور انسان کا رشتہ مسلم سماج میں گھٹن پیدا کرنے والے مُلا، ملوکانہ عہد کے اداروں سے منقطع کر کے براہِ راست اللہ تعالیٰ، اس کے شارح رسول اللہ ﷺ اور اس کی کتاب قرآن سے جوڑ دیا۔ اسی تصور کے تحت اقبال نے تنگ نظر مذہبی پیشوائیت اور فرقہ بندی کی جڑ کاٹنے کیلئے، ایک منتخب پارلیمان کا تصور پیش کیا اور اہل رائے کی ایک ایسی منتخب پارلیمان کو ریاستی سطح پر اجتہاد کا حقدار گردانتے ہیں اور ایسی پارلیمان کے ارکان ہی ایسی مسلم ریاست کی تشکیل کر سکتے ہیں، جو قرآن کے تصور کے مطابق ہو۔ مگر یہ تبھی ممکن ہے جب علماء ''اجتہاد'' کے معنی و مفاہیم پر غور و فکر کریں۔